بازو صرف دو پتلی پتلی نسوں کے سہارے لٹک رہا تھا۔ بیہوش ہونے سے پہلے اس نے صاف طور پر لڑنے والوں کو اپنے اردگرد دوڑتے ہوئے' گرتے ہوئے' تیز تیز گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے سنا۔

دائرے' دائرے۔ چہرے' چہرے' چہرے۔ ستارے۔ ہزاروں لاکھوں ستارے۔ کبھی دور مغرب میں ایک اکلوتا سبز ستارہ جگمگاتا۔ چکر۔ جیسے ہوا کے طوفان میں ایک چکر دار سیڑھی۔ چڑھائی' اڑان' دونوں بازوؤں کی جگہ دو پر۔ اوپر' اوپر' بہت اونچی اڑان۔ پھر خوبصورت جنگل آئے جن کے راستوں پر زرد پتے گر رہے تھے اور دونوں پر پھیلائے کوئی درختوں کے بیچ بیچ پرواز کر رہا تھا۔ چہرہ چاند کی روشنی میں ستا ہوا' غلیظ چہرہ۔ آگے سمندر آئے' اور شکستہ ساحل جن پر سفید بادبانی کشتیاں سکون سے کھڑی تھیں۔ پھر وادی۔ بہت طویل وادی اور سائے جن پر آہستہ آہستہ بارش ہو رہی تھی۔ چہرہ' موٹے ہونٹ اور بھوری آنکھیں۔ گہرے سائے اور خاموش' نرم بارش۔ پھر ہونٹ ایک دم پھیل گئے اور سر پیچھے پھینک کر کوئی ہنسا۔ مزید چکر۔ چاند پر برف گرنے لگی۔ ایک جہاز تیزی سے پرواز کرتا ہوا پاس سے گزرا اور چاند پر چلا گیا۔ ستارے لمبی لمبی روشن لکیریں بناتے ہوئے آسمان پر لٹکنے لگے' برف باری تیز ہو گئی۔ لکڑی کی میز اور اس پر جھکے ہوئے چند اجنبی چہرے۔ اوزار۔ کافور کی بو [illegible]۔ ایک سمندری جہاز بادلوں پر کھڑا سیٹیاں بجا رہا تھا اور خالی کمروں میں ستارے لٹک رہے تھے۔ سفید پروں والا پرندہ آہستہ آہستہ پر ہلاتا بادلوں میں غائب ہو گیا۔ چکر۔ چکروں کا تسلسل۔ سیٹیاں [illegible]۔ چکر چکر چکر۔

اس [illegible] چھت اور دیواریں [illegible]۔ [illegible] محسوس ہوا کہ وہ بہت دیر سے آنکھیں کھولے پڑا تھا۔

دو سپاہی اسٹریچر کو ان کے بیچ بازوؤں پر باندھے اس کے پاؤں کے قریب بیٹھے تھے اور گاڑی تیزی سے تارکول کی سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ کھڑکی کے شیشے میں نرم دھوپ چھن چھن کر آ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں جھکی ہوئی سیاہ فام عورتیں شاید چاول کی پنیری بو رہی تھیں۔

''چاول بونے کا موسم ہے؟'' اس نے دل میں سوال کیا۔ سڑک کے کنارے فوجیوں کے خیمے تیزی سے گزرنے لگے۔ اس نے گردن موڑی۔ بازو کہنی پر ختم ہو گیا تھا اور بہت سی سفید پٹیوں میں لپٹا سٹریچر کے ساتھ جکڑا ہوا تھا۔ خوف اور نقاہت سے وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

صبح کی ہلکی سرد دھوپ کھڑکی کے راستے اس کے چہرے کے نچلے حصے پر پڑ رہی تھی اور بڑھی ہوئی داڑھی میں سے جلد کا زرد رنگ دکھائی دے رہا تھا۔ کمبل کو ٹانگوں پر کھینچ کر وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ نمایاں طور پر کمزور ہو چکا تھا۔ اس کے جبڑے اور رخساروں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں اور تیکھے' خوب صورت نقوش میں کرختگی اور جماؤ آ گیا تھا۔ دہانے کی مضبوطی سے ایک پورے جوان آدمی کی پختگی ظاہر ہوتی تھی۔ سب سے نمایاں تبدیلی بہرحال اس کی آنکھوں میں آئی تھی' بڑی بڑی سیاہ' چمکدار اور بے چین آنکھیں جو بڑی گہرائی سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔

ہسپتال ایک سکول کی عمارت میں تھا۔ لمبا ہال کمرہ زخمیوں سے بھرا پڑا تھا۔ زمین پر بڑھی ہوئی داڑھیوں والے مریض شانے سے شانہ بھڑائے ایک دوسرے کی ٹانگوں میں سر دیئے پڑے تھے۔ ڈاکٹروں اور تیمارداروں کے گزرنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ ان کی ٹانگوں اور بازوؤں کے درمیان قدم رکھتے، مریضوں کی کراہوں اور گالیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھتے۔ باقی تمام کمرے اور برآمدے اور صحن زخمیوں سے اٹے پڑے تھے۔ صحت یاب ہوتے ہوئے مریض اپنی جگہوں پر بیٹھے بیٹھے نئے آنے والوں کی چیخ و پکار کو بڑی مانوسیت اور لاتعلقی سے دیکھتے رہتے، جیسے تندرست بھینسیں بچہ جنتی ہوئی بھینس کو دیکھتی ہیں۔

نعیم کے ساتھ والے بستر پر کچھ دیر ہوئی ایک پٹھان سپاہی کو لایا گیا جو ایک روز قبل زخمی ہوا تھا۔ اس کی ٹانگ گھٹنے کے اوپر سے کاٹ دی گئی تھی اور وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اس کی داڑھی اور مونچھوں کے بال کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے اور قمیض کے گندے کف پر جوئیں چل رہی تھیں۔ ڈاکٹر کچھ دیر پہلے راؤنڈ کرتا ہوا اس کے پاس سے گزرا تھا۔

''کیا حال ہے، جوان؟'' اس نے رک کر اپنے مخصوص بے حس لہجے میں پوچھا تھا۔

''نرس کا بچہ کیا حال ہے؟ ہیں؟'' وہ سوجی ہوئی آنکھیں کھول کر چلایا، پھر دفعتاً پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''میں لنگڑا ہو گیا ہوں۔ میں......''

''جمعے کے روز تمہاری آخری ڈریسنگ ہوگی، حوالدار نعیم احمد خان۔''

ڈاکٹر [illegible] گیا۔

اس کے پیچھے پیچھے ادھیڑ عمر کی خوب صورت، اداس، خاموش سسٹر ڈورس پانی کا برتن اٹھائے زخمی پٹھان کے پاس آئی۔ وہ تکیے میں منہ دے کر رنج اور تکلیف کی وجہ سے داڑھی نوچ رہا تھا۔

''مت نوچو داڑھی۔'' سسٹر ڈورس نے پیار سے دھمکایا اور اس کا منہ دھلانے لگی۔

نعیم گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ کس قدر مقدس عورت ہے، اس نے سوچا۔

''مت روؤ۔'' وہ زخمی کو مصنوعی غصے کے ساتھ جھڑک رہی تھی۔

''سسٹر، ہم سب تمہارے بچے ہیں۔'' نعیم نے خوشدلی سے کہا۔

سسٹر نے اسے سیاہ، گہری آنکھوں سے دیکھا اور اداسی سے مسکرائی۔ ''یاد ہے پچھلے مہینے جب تم آئے تھے تو اسی طرح رو رہے تھے؟''

''تم جھوٹ کہتی ہو۔ میں کبھی نہیں رویا۔''

''تمہیں اب یاد بھی نہیں رہا۔ اس وقت تم بہت چھوٹے سے تھے۔''

وہ ہنسا۔ ''سسٹر، تم بڑی محنت کرتی ہو۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر نعیم کو دیکھا، پھر کپڑے سے پٹھان کا چہرہ خشک کرنے لگی۔ اس سے فارغ ہو کر واپس جانے کی بجائے وہ نعیم کے پاس آ کھڑی ہوئی اور شستہ انگریزی میں بولی۔

''زخمیوں سے مجھے بہت کم ہمدردی ملتی ہے، حوالدار۔ میرے دو بچے ہیں اور میرا خاوند پاگل خانے میں

UrduPhoto.com

ہے۔ اس تمام عرصے میں میں نے غلیظ اور بدبودار انسانوں کی خدمت کی ہے اس لئے کہ میرے بچے نفیس، صاف ستھری فضا میں پل سکیں۔" وہ رکی۔ "اس جگہ محض بیماری اور موت ہی نہیں ہوتی، حوالدار۔ سات دن کے بعد تم چلے جاؤ گے، لیکن اگلی بار جب تم زندگی کی خوبصورتی اور محنت اور اچھائی کو دیکھنا چاہو تو یہاں آ جانا۔" وہ گندے پانی کا برتن اٹھا کر چپتی بچاتی، رشتہ بچاتی باہر نکل گئی۔ وہ آہستہ سے بستر پر سے اٹھا اور اپنے ہمسائے کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"امیر خان۔"

"گھر؟"

"کاکا خیل۔ پشاور۔"

"کہاں زخمی ہوئے تھے۔"

"مجھے نام نہیں آتا۔"

"رجمنٹ؟"

"فرنٹیئر فورس [illegible]۔"

اس تمام دوران میں زخمی کی نظریں اس کے آدھے بازو پر جمی رہی تھیں۔ نعیم نے وہ بازو آگے بڑھایا اور ہنسا۔ "ہاں۔ اس کو بھی کاٹ دینا پڑا۔"

چند [illegible] اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ ہمسائیگی کے ایک لمحے میں اس نے ایک مشترکہ دکھ کو پہچان لیا تھا۔

باہر برآمدے میں دوپہر سے پہلے کی دھوپ پھیل رہی تھی، اور شفاف شیشے کی سی فضا میں شہد کی مکھیاں اڑ رہی تھیں۔

آخری پٹی کروانے کے فوراً بعد نعیم نے یونٹ میں رپورٹ کی جہاں سے اسے بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز بھیج دیا گیا۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز کی اونچی، مغربی طرز کی عمارت میں داخل ہو کر اس نے اپنے کاغذ ایک کلرک کے حوالے کئے اور برآمدے میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اسے بیٹھے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کے سامنے جاٹ گھر کا خالق کھڑا تھا۔ انھوں نے کسان فوجیوں کے انداز میں ایک دوسرے کو پکارا اور گرمجوشی سے مصافحہ کرنے لگے۔ پھر خالق کی نظریں اس کی لٹکتی ہوئی خالی آستین پر رک گئیں۔

"پیچھے سے میں تمھیں پہچان نہیں سکا۔"

نعیم خاموش رہا۔

"یہ......یہ۔"

"ہاں۔" نعیم نے لاپروائی سے کہا۔ "میں زخمی ہوا تھا۔"

اس نے سگریٹ نکال کر خالق کو دیا۔ دونوں خاموشی سے دھواں اڑانے لگے۔

UrduPhoto.com

''تمہیں یاد ہے نعیم جب ہم کبڈی کھیلنے کے لئے روشن پور آئے تھے تو اس ہاتھ کی ضرب سے تم نے میرا کان توڑ دیا تھا۔'' اس نے غیر ارادی طور پر کان کو چھوا۔

نعیم ہنسا۔ ''تمہاری بددعا لگی ہوگی۔''

''مذاق مت کرو۔ مجھے دکھ ہوا ہے۔''

''کوئی اور بات کرو۔'' نعیم نے بے چینی سے اردگرد دیکھا۔ مجھے اصل میں وہ واقعہ یاد نہیں رہا۔ تم زخمی ہوئے تھے؟''

''میں سپلائی میں تھا۔''

''انبالہ بریگیڈ میں اور سب لوگ؟''

خالق آنکھیں سکیڑ کر ہولے ہولے بولنے لگا: ''عبداللہ کو پچھلے مہینے کراس ملا تھا۔ میرا بھائی طفیل حوالدار ہو گیا ہے۔ فرانس میں ہے۔ روشن سنگھ ناکارہ ہو کر واپس چلا گیا تھا۔ روشن پور کا مہندر سنگھ مارا گیا۔''

نعیم کے ہاتھوں میں سگریٹ کانپنے لگا۔ خالق نے بات جاری رکھی۔

''وہ بالکل گدھا نکلا۔ سنا ہے جب ان کی کمپنی ایڈوانس میں پڑی تو اس نے ہلنے سے انکار کر دیا۔ کمپنی کمانڈر کے بار بار حکم دینے پر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔''

''پھر؟'' نعیم نے بے دھیانی سے پوچھا۔

''پھر [illegible] پر کمزور تھا۔'' خالق نے سر کو جھٹک کر بتایا۔

''یہاں کا موسم بھی عجیب ہے۔'' نعیم نے بے چینی سے کہا۔ ''دھوپ نکلے تو گرمی، نہ نکلے تو سردی۔''

''تمہارا دوست تھا۔'' خالق نے کہا۔

نعیم نے لرزاں انگلیوں سے سگریٹ کے تین چار کش لئے اور اسے دور پھینک دیا۔ پھر اس نے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پر ہاتھ پھیرا۔ ''روشن پور میں وہ میرا واحد دوست تھا۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ فرانس میں۔''

''فرانس میں؟'' خالق نے صرف اتنا کہا۔ لوہے کے بنچ پر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

کچھ دیر بعد وہ ایڈجوانٹ کے سامنے پیش ہوا۔

''حوالدار نعیم احمد خان؟''

''یس سر......'' وہ تن کر کھڑا تھا۔

''ہمیں افسوس ہے تم زخمی ہوئے۔ لیکن رجمنٹ کو تمہاری بہادری پر فخر ہے۔ ہم نے ملٹری کراس کے لئے تمہاری سفارش کی ہے۔ اس سلسلے میں ابھی تک ڈویژنل ہائی کمانڈ کے احکامات کا انتظار ہے۔'' بوڑھے کرنل نے اس کے چہرے پر سید ھا دیکھتے ہوئے کہا۔ ''رائفل اٹھا سکتے ہو؟''

''یس سر۔''

''اس عرصے میں تم زخمی قیدیوں پر ڈیوٹی دو گے۔''

"یس سر۔"

"ڈس مس۔"

برآمدے میں مڑتا ہوا وہ ایک دھچکے کے ساتھ رکا اور پچھلے پاؤں پر لوٹ آیا۔ وہ دو مریض ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔ ایک کا چہرہ سوج کر کپا ہو رہا تھا۔ دوسرے کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی' لیکن اس کے ہونٹ خوبصورت تھے اور چمکیلے زرد رنگ کے بال تھے۔ ان سے اگلے زخمی کے اوپر بوتل لٹک رہی تھی اور ربڑ کی نالی کے ذریعے اس کے جسم میں خون پہنچایا جا رہا تھا۔ اس سے اگلے کے بائیں ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلیوں پر خون آلود پٹی بندھی تھی۔ اس سے اگلا زخمی اور اس سے اگلا' اور اس سے اگلا۔ وہ سب بھاری' بیزار چہروں کے ساتھ لیٹے اور بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی آنکھوں میں دودھ دینے والے جانوروں کی سی بے بسی تھی۔ نعیم بے خیالی سے انہیں دیکھتا ہوا گزر گیا۔ اگلے موڑ پر اس کا سپاہی رائفل اٹھا کر 'اٹینشن' ہو گیا۔ نعیم نے کندھے پر رائفل کو درست کیا اور سیڑھیوں کے اوپر جا کھڑا ہوا۔ نیچے دو گلہریاں بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں۔ یکلخت بے چین ہو کر وہ مڑا اور برآمدے میں چلنے لگا' لیکن اگلے 'ونگ' میں جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ اسی برآمدے میں چکر لگاتا رہا۔

"وہ پہچان لے گا۔" ایک خیال بار بار اس کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ "یقیناً۔ خدایا... یہ کیسے سخت جان لوگ ہیں۔" سیڑھیوں پر گلہریاں دُمیں اچھالتے ایک دوسری کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔

"اب کیا ہو گا [illegible] اس طرف کے سپاہی کو چیک کرتا ہے۔ بہر حال۔"

سوجے ہوئے چہرے والے نے اپنا بے تاثر چہرہ اٹھایا اور بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ مضبوطی سے جبڑے پر جبڑا جمائے وہ اگلے 'ونگ' میں مڑا اور سیدھا دیکھتے ہوئے چلنے لگا۔ سپاہی نے رائفل کندھے پر رکھ کر سلام کیا۔ وہ دیوار پر نظریں جمائے اس کے پاس سے گزر گیا۔

"اس نے دیکھا ہے۔ اس نے دیکھ لیا ہے۔ یقیناً۔ قطعی۔ اس کے پاؤں ہل رہے تھے۔" وہ آدھا ایڑیوں پر گھوما۔ "اب اس نے دیکھ لیا ہو گا۔ بازو سے دیکھنے پر میں پہچانا جاتا ہوں؟ پتہ نہیں۔ شاید!" وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ ہوا سے اس کی خالی آستین ہل رہی تھی۔ سامنے والے درخت کے میلے' زرد پتوں پر بارش بہت دیر سے نہیں ہوئی تھی۔

"وہ میرا کیا کر سکتا ہے؟ ایں؟ ہاں' وہ کیا کر سکتا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔" اس خیال نے اسے بے حد سکون پہنچایا اور وہ حیران ہوا کہ اب تک وہ کیا سوچ رہا تھا۔

سامنے پچکے ہوئے گالوں والا ادھیڑ عمر جرمن کسان دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا اس کے سامنے سے گزر گیا۔ آگے جا کر وہ مڑا اور زخمی کے سرسوں کی طرح کے زرد' کرخت نقوش والے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ نعیم دوبارہ اس کے سامنے سے گزرا۔ تیسری بار جب وہ اس کے قریب سے گزر رہا تھا تو زخمی نے آنکھیں کھول دیں اور سوئی سوئی بیزار نظروں سے ارد گرد دیکھنے لگا۔ نعیم

پر سے اس کی نظریں دوہری جاندار' بے جان چیزوں کی طرح گزر گئیں۔ ان نظروں میں شناسائی کی رمق تک نہ تھی۔ نعیم نے دل میں عجیب سی بے چینی محسوس کی۔ وہ غیر ارادی طور پر ایک لمحے کے لئے اس کے سامنے رکا۔ اسے اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پا کر زخمی نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ نعیم نے حیرت سے اس کی گہری ملائم آواز کو سنا جس کی اس کے چہرے سے کوئی مطابقت نہ تھی۔

''آفیسر مجھے مدد کی ضرورت ہے۔'' وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔

نعیم گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''ابھی یہاں دھوپ آجائے گی۔'' وہ تکلیف سے بول رہا تھا۔ ''ہر روز ایسا ہوتا ہے۔ یہاں کی دھوپ...... میرا مطلب ہے کہ اگر مجھے کمرے میں جگہ مل جائے تو۔''

نعیم خاموشی سے اٹھ کر ڈاکٹر کے پاس آیا۔ ''ڈاکٹر ایک مریض سخت تکلیف میں ہے۔''

ڈاکٹر نے اکتائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک معمولی آپریشن کی تیاری کر رہا تھا۔

''دھوپ ساری اس پر آرہی ہے۔''

''دھوپ تو ہر جگہ آجاتی ہے۔'' ڈاکٹر جھنجھلا کر بولا۔

''میرا مطلب ہے ڈاکٹر'' کہ اگر اسے کمرے میں ڈال دیا جائے۔'' وہ مریض پر جھک

''لیکن کیپٹن'' نعیم آگے بڑھا۔ ''وہ سخت تکلیف میں ہے۔'' ڈاکٹر اوزار برتن میں رکھ کر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ ''تمہیں [illegible]''

''لیکن کیپٹن...... وہ تو مریض۔''

''مریض...... جرمن۔'' سب نے دیکھا کہ غصے کے مارے ڈاکٹر کے کان سرخ ہوگئے اور اس کی گردن کے بال اٹھ کھڑے ہوئے۔ آخر اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور دانت پیس کر [illegible] سا ''سوری......'' کہنے کے بعد اوزاروں پر جھک گیا۔

نعیم نے ایک آخری کوشش کی: ''کیپٹن' سر' وہ میرے ایک دوست کی طرح ہے۔ اس کا چہرہ۔ بہت عزیز دوست۔ وہ فرانس میں مارا گیا تھا۔''

''زیادہ سے زیادہ تم برآمدے میں ترپال لگا سکتے ہو۔'' ڈاکٹر نے جھکے جھکے کہا۔

سپاہی کی مدد سے ترپال لگا چکنے کے بعد وہ اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

زخمی اسی گہری' نرم آواز میں بولا: ''میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں' سارجنٹ۔''

''تم کہاں زخمی ہوئے تھے؟''

''اکیڈ نیو کی دلدل میں...... تم؟''

''میں؟ ادر...... فرانس میں۔'' نعیم نے جھوٹ بولا۔

اس نے آنکھیں میچ کر سر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اس کے پتھریلے چہرے پر صرف ہونٹوں کے گرد ہلکا سا تبسم تھا۔ اس کے سینے پر چھوٹے چھوٹے سرخ دانے نکلے ہوئے تھے اور پسلی اور پیٹ پر پٹیاں بندھی تھیں۔ نعیم

رائفل کے پٹے پر ہاتھ رکھے اسے دیکھتا رہا۔ ''میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھے پہچانتے ہو؟'' اس نے دل میں کہا۔

زخمی قیدیوں کا ہسپتال ایک قدیم گرجا گھر کے احاطے میں تھا۔ نعیم سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں داخل ہوا۔ زخمی بہت کم بات کرتا تھا۔ وہ ہر روز نعیم کو دیکھتا اور ہولے سے مسکرا دیتا۔ گو نعیم اسے دیکھتے ہی اس سے باتیں کرنے اس کی آواز سننے کے لئے بے تاب ہو جاتا۔ ہر روز اس کے پاؤں کے پاس رک کر وہ پوچھتا: ''کیسے ہو؟'' جس کے جواب میں اس کے منجمد چہرے پر صرف ہونٹ مسکراتے اور وہ آنکھیں بند کر لیتا۔ نعیم کے دل میں بے چینی کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔

اس روز نعیم کو دیکھ کر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکنے لگیں۔ نعیم گھٹنا ٹکا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''تم نے میری مدد کی تھی سارجنٹ۔ میں بھی تمہارے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔'' بات کرتے میں اس کی آنکھوں میں وہی نامعلوم سی نرمی آ گئی جس کو دیکھنے والا محسوس نہیں کرتا لیکن بعد میں ہمیشہ کے لئے واضح طور پر یاد رہتی ہے۔ ''میں نے یہ کام اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ کل میری آخری پٹی ہو گی۔ میں کام کر سکتا ہوں۔ اگر تم مجھے چیڑ کی لکڑی کا ایک ٹکڑا اور چند اوزار لا دو۔ میں تمہارا بازو بنا دوں گا۔''

''اوہ......'' نعیم ہنسا۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ۔ لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں۔''

''[illegible]'' [illegible] آواز کا خفیف سا ارتعاش نعیم کے کانوں میں گونجتا رہا۔

''اچھا'' نعیم نے سر جھکا کر کہا۔ ''تمہیں کون سے اوزار چاہئیں؟''

اگلے دن نعیم نے مطلوبہ اوزار اور چیڑ کا دو فٹ لمبا ٹکڑا لا کر اس کے آگے رکھ دیا۔

''ڈاکٹر سے بڑی بحث کرنی پڑی۔''

''کیا کہتا تھا؟''

''کہتا تھا اوزاروں سے تم اپنا زخم کھول لو گے۔''

زخمی مخصوص دھیمے انداز میں مسکرایا اور فوراً کام میں مشغول ہو گیا۔

''مجھے بتا دینا چاہیے۔'' اس نے بارک میں لیٹے لیٹے ہزارویں بار سوچا اور اپنی جگہ پر کسمسایا۔ اس کی بے خواب آنکھیں جل رہی تھیں اور وہ بڑی دیر سے پشت پر لیٹا تاریک چھت کو گھور رہا تھا۔ نصف رات کے بعد نیند آنی شروع ہوئی اور ایک شدید کربناک کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ روزانہ رات کو اسی طرح ہوتا۔ نیند آتی مگر وہ سو نہ سکتا۔ بخار کی طرح جلتا ہوا غبار اس کی آنکھوں میں بھر جاتا جو آہستہ آہستہ اس کے سارے جسم کو گرفت میں لے لیتا۔ وہ جمائیوں پر جمائیاں لیتا' آنکھیں نیند کے بوجھ تلے بند ہو جاتیں' جسم ڈھیلا پڑ جاتا' پھر ایک بے چینی اس کے دل سے نکلتی اور سارے جسم پر پھیل جاتی اور وہ مرتے ہوئے بیل کی طرح جھرجھرانے لگتا۔ وہ انسانی

جذبات کے شدید کربناک دور میں سے گزر رہا تھا۔ چند دنوں میں وہ نمایاں طور پر دبلا ہو گیا تھا اور بے خوابی کا خمار اس کی آنکھوں میں پھیل رہا تھا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ زخمی سپاہی اپنے کام کو جاری رکھے۔ ہر روز رات کو وہ فیصلہ کرتا کہ صبح جاتے ہی اس سے تمام اوزار چھین لے گا اور لکڑی کا وہ کمبخت ٹکڑا نوچ کر پھینک دے گا۔ یا..... اس کو ساری بات بتا دے گا۔ لیکن ہر روز صبح برآمدے میں داخل ہوتے ہی اس کے حواس جواب دے جاتے اور اس کا ارادہ دوپہر کی برف کی طرح پگھلنے لگتا اور اسے دیکھتے ہی زخمی کے چہرے پر ہلکی سی منجمد مسکراہٹ پیدا ہوتی اور وہ جلدی سے جھک جاتا۔

''یہ سب تم کیا کر رہے ہو؟'' ایک روز نعیم نے خفگی سے کہا۔ وہ چہرہ اٹھا کر تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔

اب میں بتا دوں گا۔ اب میں اسے بتانے والا ہوں سب۔ نعیم نے سوچا ''سنو۔ ایک بات۔ تمہیں بتاؤں۔'' زخمی اسی طرح دیکھتا رہا۔

نعیم نے اس کی کوری، مخلص آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور ندامت سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''کیا ہے؟'' کچھ دیر کے بعد اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا تمہارے لئے کام کرنا اچھا نہیں۔''

''میں ٹھیک ہوں۔'' لکڑی پر جھکنے سے پہلے اس نے کہا۔

بیٹھے بیٹھے نعیم کا جی گھبرانے لگا۔ ''تم باتیں کیوں نہیں کرتے؟'' اس نے پوچھا۔

''[illegible]''

''[illegible]''

''باتیں کروں گا تو کام کیسے ختم ہوگا۔''

نعیم خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ آج پہلی بار وہ دھیان سے اس لکڑی کے ٹکڑے کو دیکھ رہا تھا جس نے ان چند دنوں میں ایک لمبی گول کلائی اور مضبوط مشقتی انسانی ہاتھ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ اسے گھٹنوں میں دبائے جھکا ہوا نہایت انہماک اور کاریگری سے انگلیوں کے جوڑ بنا رہا تھا۔ اس نے کام کرتے کرتے سر اٹھایا اور بولا: ''دوستی خاموشی اور محنت میں پرورش پاتی ہے۔ باتیں ہم بازاروں اور دکانوں میں کرتے ہیں۔''

''تم میرے دوست ہو؟'' نعیم نے مسکرا کر کہا۔

''میں سمجھتا ہوں۔''

''مگر ہم تو دشمن ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے ہیں۔''

''نہیں۔'' وہ جھکا جھکا بولا۔ ''میں یہ سب نہیں سمجھتا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ سب میدان جنگ میں تھا۔ سب۔ یہاں تم نے میرے اوپر احسان کیا ہے' میں نے تمہارے لئے محنت کی ہے۔ ہم دونوں دوست ہیں۔'' پھر ہاتھ روک کر اس نے سر اٹھایا۔ ''سنو۔ ہمبرگ کے قریب میرا گاؤں ہے۔ میں تیس سال تک وہاں رہا اور کسی سے نہیں لڑا۔ اب اگر واپس چلا گیا تو کسی سے نہیں لڑوں گا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ یہاں اگر میں لڑا یا تم لڑے تو کون قصور وار ہے؟ مجھے سب پتہ ہے۔ میں ترکھان کا کام کرتا تھا لیکن گاؤں کی عدالت والے مجھ سے آ کر مشورہ لیا

کرتے تھے۔ یہ سب زندگی کا بہاؤ ہے۔ کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جانتا ہوں۔‘‘
اس کی آواز بلند ہو گئی اور آس پاس کے چند زخمی دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ جلدی سے لکڑی کے ٹکڑے پر جھک گیا۔ باتوں کے جوش کی وجہ سے ابھی تک اس کے زرد ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی۔
’’یہ محنتی ہاتھ ہے۔‘‘ نعیم لکڑی کو چھو کر بولا۔
’’یہ ایک ایماندار آدمی کا ہاتھ۔‘‘ زخمی نے سنجیدگی سے کہا۔ زرد مٹیالے بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر ہل رہی تھی۔

بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز سے لوٹنے کے بعد نعیم پہلی بار رات بھر سویا۔ سونے سے پہلے اس نے آنکھیں بند کر کے دل میں کہا: ’’کل میں اسے بتا دوں گا۔ آخر کیا فرق پڑتا ہے جب کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔‘‘
سورج گرجے کے کلس پر چمک رہا تھا جب وہ کیمپ وارڈ میں داخل ہوا۔ اس کے پاس جانے سے پہلے وہ دیر تک برآمدوں اور کمروں کے چکر لگاتا رہا۔
آج وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، آنکھیں بند کیے، دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ نعیم آہستہ آہستہ چلتا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ کاہلی سے آنکھیں کھول کر مسکرایا۔
’’تم جاگ گئے؟‘‘ نعیم نے پوچھا۔
’’میں [illegible] مجھے پتہ [illegible] آ [illegible]‘‘
نعیم کا دل بیٹھ گیا۔
’’آج تم تر و تازہ نظر آ رہے ہو۔‘‘ جرمن نے کہا۔
’’مجھے ملٹری کراس مل گیا ہے۔ کل بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز میں پیشی تھی۔ آج میرا یہاں آخری دن ہے۔‘‘
جرمن کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ’’میں خوش ہوں۔‘‘ اس نے کہا اور کمبل میں سے اوزار اور لکڑی کا بازو نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ’’شکر ہے کل میں نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔‘‘
نعیم نے چیزیں اس کے ہاتھ سے لے کر جلدی سے بڑے کوٹ کی جیب میں ڈال لیں۔ چند لمحے تک وہ اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔
’’تمہیں افسوس ہے؟‘‘ نعیم نے پوچھا۔
’’کیوں؟‘‘
’’اپنے ملک میں ہوتے تو تمہیں بھی کراس ملتا۔‘‘
’’اوہ۔‘‘ وہ ہنسا۔ ’’کیا فرق پڑتا ہے؟ میں اپنے گاؤں واپس جا کر کام شروع کرنا چاہتا ہوں۔ بس۔‘‘
نعیم کھسک کر اس کے قریب ہو گیا۔ ’’سنو، تم بھاگنا چاہتے ہو؟‘‘ جرمن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
’’مجھے بتاؤ۔‘‘ نعیم نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ’’میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔‘‘
اتنے عرصے میں پہلی بار وہ ہنسا۔ کسانوں کی طرح منہ کھول کر گہری، مختصر ہنسی۔

''اوہ...... نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے افسوس ہے۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ چند سال قید میں کاٹ کر میں واپس چلا جاؤں گا۔ دیانت دار آدمی کی طرح۔ مجھے یقین ہے یہ مجھے گولی نہیں ماریں گے۔ میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ بہر حال میں خوش ہوں کہ جنگ کے باوجود بھی ہم دوست بنے...... میں تمہیں یاد رکھوں گا۔''

دیر تک وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے اور مصافحہ کرتے رہے۔ ''اب میں اسے بتا رہا ہوں۔ ابھی۔'' اس نے سوچا۔ ''دوست۔'' اس نے پوری قوت سے اس کا ہاتھ دبایا اور دیر تک دبائے رکھا' پھر گرمجوشی سے ہلانے لگا اور ہلاتا رہا۔ ''خدا حافظ۔'' آخر بند ہوتے ہوئے گلے سے اس نے کہا اور اٹھ کر تیزی سے برآمدے میں مڑ گیا۔

آخری سیڑھی پر پاؤں رکھ کر اس نے آخری بار مڑ کر دیکھا۔ سامنے لیٹے اور بیٹھے ہوئے مریضوں کی لمبی قطار تھی۔ اس کے دماغ میں زور سے کوئی چیخا۔ جیب میں لکڑی کے ٹکڑے پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ وہ مڑا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ زندگی میں پہلی بار اس کا جی چاہا کہ چیخیں مار مار کر روئے۔

باہر سڑک پر چند بچے ایک دوسرے کی قمیضیں پکڑے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

☆......☆......☆

UrduPhoto.com

(۲)

ہندوستان

افسردگیٔ سوختہ جاناں ہے قہر میر
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

میر تقی میر

UrduPhoto.com

(۱۲)

گاؤں کی سوئی سوئی گرد آلود فضا اسی طرح قائم تھی۔ ان برسوں میں روشن پور کے بیسیوں نوجوان اجنبی سرزمینوں میں ہلاک ہو گئے تھے۔ جنگ کے میدانوں میں بکھرے ہوئے ان کے محبوب' مضبوط جسم تیز دھوپ میں بخارات بن کر اڑ گئے اور نئے سیلابوں نے' نئی آندھیوں اور طوفانوں نے ان کی ہڈیاں زمین میں دبا دیں۔ بیسیوں عورتیں بیوہ ہو گئیں اور لڑکیاں محبت میں غریب ہو گئیں۔ روشن پور کی زمینوں میں سیلاب آئے اور فصلیں تباہ ہو گئیں اور کسان قرضے اور بھوک کے نیچے جھک گئے۔ جانور بیماری سے مر گئے یا بھوکے کسانوں نے کاٹ کر کھا لئے اور عورتوں اور بھینسوں [illegible] کھا گئے' اور [illegible] پاگل آنکھوں [illegible] کسانوں کے ننگے بچے گلیوں میں آوارہ پھرتے تھے اور چھتوں پر بڑھے ہوئے پیٹوں والے زرد رو بچے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھتے تھے' تو دور سے گاؤں پر جلے ہوئے جنگل یا بمباری سے تباہ شدہ قلعے کا شبہ ہوتا تھا۔

لیکن نیا موسم اپنے پورے رنگ روپ اور آب و تاب کے ساتھ آیا۔ سیلاب کا پانی اتر گیا اور بارشوں سے گرے ہوئے مکانوں کی دیواریں پھر سے کھڑی ہو گئیں اور ہر دم جوان ہوتے ہوئے لڑکوں اور بیلوں اور بوڑھے ہوتے ہوئے کسانوں نے سیلاب کی ڈالی ہوئی سیاہ' زرخیز مٹی میں ہل چلایا اور گیہوں اور چنے اور دوسرا اناج بویا۔ دن رات کی کڑی محنت سے کھیتوں میں سبز ریشمی فصل اٹھی اور گندم کے دانوں میں گودا پڑا اور عورتوں کی چھاتیاں دودھ سے بھر گئیں اور ان کی کوکھ میں انسانی بیج بڑھنا شروع ہوا اور تخلیق کی پرسکون شفاف فضا ہر طرف پھیل گئی۔ لڑکیوں نے نئے نئے جوانوں سے محبتیں لگائیں اور رو رو کر اور گمشدہ محبوب یاد کر کے انہیں بتایا کہ جنگ کیسی خراب شے ہوتی ہے۔

فصلوں کے درمیان کھڑے ہو کر کسانوں نے پرقناعت نظروں سے دیکھا کہ صبح کی تازہ' بے ضرر دھوپ ان کی گلیوں اور مکانوں کی منڈیروں میں داخل ہوئی اور گہرے نیلے' بے داغ آسمان کے مقابل عزی کے چمکیلے تار اور آک کی "بوڑھی مائی" گاؤں کے اوپر اوپر لہرانے لگیں اور بچے ان کو پکڑنے کے لئے شور مچاتے ہوئے دوڑے۔ پھر سورج اونچا ہوا تو دھوپ ان کے صحنوں اور دالانوں میں پھیل گئی اور ایک خواب آلود' خیالی گرد نے' جو زندگی اور کام

کی علامت ہوتی ہے' گاؤں کو لپیٹ میں لے لیا اور کھیتوں میں سے اٹھ کر وہ سائے میں آ بیٹھے اور دوپہر کا کھانا کھاتے اور تمباکو پینے لگے' اور اس سارے وقت کو انہوں نے بڑے سکون اور دل بستگی سے برداشت کیا' کہ جو کچھ گزرا وہ ہندوستان کے کسان کا مقدر تھا اور ایسا ہوتا ہی آیا تھا۔

گاؤں کی سوئی ہوئی گرد آلود فضا اسی طرح قائم تھی۔ نعیم کو گاؤں میں رہتے چند مہینے ہو چلے تھے۔ وہ کبھی کبھی ہل چلاتا' لیکن کاشت کاری کی محنت کے اب وہ قابل نہیں رہا تھا۔ وہ شام کے وقت اکثر پنچایت گھر میں جاتا اور بوڑھے جوان سبھی اٹھ کر اس کا استقبال کرتے' جوان سروں پر پگڑیاں رکھ لیتے اور بوڑھے اس کو اپنے برابر جگہ دیتے' کیونکہ وہ واحد شخص تھا جو ابھی تک روشن پور میں جنگ سے زندہ لوٹ کر آیا تھا اور سینے پر امتیازی نشان لگاتا تھا اور ایک مربع زمین جسے سرکار کی طرف سے ملی تھی۔ لڑکیاں اسے دیکھ کر احترام سے رستہ چھوڑ کر چلنے لگتیں کیونکہ نعیم کی ماں نے انہیں بتا رکھا تھا کہ سمندر پار کے ملکوں میں کئی اجنبی عورتیں اس کی محبت میں گرفتار ہو کر اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں' مگر وہ انہیں چھوڑ کر اپنے گاؤں واپس چلا آیا تھا۔ نعیم غریب الوطنی' مشقت اور اذیت کے ایک لمبے وقفے کے بعد گاؤں کو پرسکون خواب کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ پی کھا کر کھاتا' سوتا اور کبڈی کے مقابلوں اور بیل گاڑیوں کی دوڑ میں فوجی وردی پہن کر شریک ہوتا۔

وہ [illegible] سوار [illegible] جوگندر سنگھ اور گاؤں کے دو جوان ہوتے ہوئے چھوڑ رہے تھے۔ نزدیک آ کر انہوں نے باگیں کھینچیں اور بلند آواز میں اس کا حال پوچھا۔

"کہاں کے قصد ہے ہو؟" نعیم نے پوچھا۔

"واہگرو کی فتح' سنڈوروں کو دیکھ کر....." جوگندر سنگھ بولا۔

"ملے؟"

"ہاں ایک جگہ ڈیرا ملا۔ بروڈ کا ریوڑ ہے۔"

"پھر؟"

"کل شکار ہے بڑا بھاری۔ چلو گے؟ رات میں ہم گڑھے کھودنے کو جا رہے ہیں۔"

"کل" نعیم نے کہا۔

تینوں سواروں نے باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ "ایک تیز دنکیا (سورج) اٹھنے پر آ جانا۔ لسی ہمارے ساتھ آ کر پینا۔" جوگندر سنگھ سرپٹ دوڑتی ہوئی گھوڑی پر سے مڑ کر چلایا اور پل پر سے اتر گیا۔

"اوپر بارش ہوئی ہے۔" نہر کے گدلے پانی کو دیکھ کر نعیم نے سوچا۔

صبح وہ سو کر اٹھا تو دوارے کے باہر ہلکا ہلکا شور ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے پتلون ٹانگوں پر کھینچی اور فوجی بوٹ پہن کر جمائیاں لیتا ہوا باہر نکل آیا۔ احاطے میں رک کر اس نے سفید بیل کی گردن کا زخم دیکھا اور فیصلہ

کیا کہ شکار پر جانے سے پہلے اس پر دوائی لگائے گا۔ پھر اس نے گھوڑی کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس کے پچھلے دونوں گھٹنوں کو انگلیوں میں لے کر باری باری دبایا۔ گھوڑی کی پھڑک سے اسے اندازہ ہو گیا کہ جانور تازہ دم ہے اور سواری کے لئے تیار ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے ماں کو جو دودھ بلو رہی تھی ہدایت کی کہ کام چھوڑ اس کی باگ مرمت کرنا شروع کر دے۔ پھر اس نے کونے میں سے تھوڑی سی خشک گھاس اٹھا کر گھوڑی کے آگے ڈالی اور علی کو جو دروازے میں کھیل رہا تھا' ایک ہاتھ سے اٹھا کر اس کی پشت پر بٹھا دیا۔ بچہ اس کے بال پکڑ کر گردن کے ساتھ چمٹ گیا اور اس کی ماں کپاس کے ڈھیر کو چھوڑ کر اس کی طرف بھاگی۔ نعیم ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

احمد دین کے گھر کے آگے چند لوگ جمع تھے۔ نعیم نے جماہی لے کر جوہڑ پر اور سکھوں کے باغ پر اور آسمان پر سارے میں نظر دوڑائی۔ یہ ایک سو کر اٹھے ہوئے کسان کی طرح تر و تازہ اور خوش گوار صبح تھی۔ جب دھوپ نے ابھی ابھی درختوں کو چھوا تھا اور ان پر ننھی ننھی چڑیاں ناچ رہی تھیں۔ دائیں ہاتھ والے مجمع میں شور بڑھ گیا۔

احمد دین اپنے دروازے پر کھڑا اونچے لہجے میں چیخ رہا تھا۔ روشن آغا کا منشی گھوڑی کی باگ تھامے اپنے چند خاص آدمیوں میں گھرا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ بھاگ جاؤ۔ کچھ نہیں ہے۔'' بازو ہوا میں نچا کر احمد دین چیخا۔

منشی نے حقے کے دو لمبے لمبے کش لئے اور گردن ٹیڑھی کر کے کڑے، چالاک لہجے میں بولا۔ ''ہم تمہارے مال کی تلاشی [illegible]

''تم میرے گھر میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ میں دعویٰ کر دوں گا۔'' احمد دین چیخا۔ اس کی پگڑی کھل کر زمین پر گھسٹ رہی تھی اور خاک آلود داڑھی ہوا میں اڑ رہی تھی۔ آستین شانے پر سے پھٹ چکی تھی اور غم و غصے کے آنسو اس کے رخساروں کی گہری سیاہ جھریوں میں بہہ رہے تھے۔ ''میں بتلاؤں گا کہ تم نے مجھے پیٹا' میری بے عزتی کی' میری پگڑی اتاری' میری داڑھی نوچی۔ کیا میں چور ہوں۔ ہیں؟ بھاگ جاؤ۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے تم۔'' اس نے منشی کی طرف انگلی ہلائی لیکن اس کا گلا بند ہو گیا۔

کچھ دیر تک منشی کھڑا بوڑھے کسان کو عورتوں کی طرح مٹھیاں چھاتی میں دے کر روتے ہوئے دیکھتا رہا اور اس کے دل میں اس مخصوص خوف نے سر اٹھایا جو پکی عمر کے سادہ لوح دہقانوں اور مزدوروں کو روتے دیکھ کر ہر انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنے آدمیوں کو لے کر چپ چاپ ایک طرف کو چل پڑا۔

نعیم آہستہ آہستہ چلتا ہوا احمد دین کے پاس جا کھڑا ہوا' جو اب بے کواڑ کے دروازے میں بیٹھ گیا تھا اور آنسو اس کے رخساروں پر خشک ہو رہے تھے۔ صرف ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس کھڑا رہ گیا تھا۔

''کیا بات ہے چچا؟'' نعیم نے پوچھا۔

''مولانہ لینے آئے تھے۔'' احمد دین کی بجائے لڑکے نے جواب دیا۔

''مولانہ؟''

''روشن آغا نے موٹر خریدی ہے۔''

''پھر؟''

''ہمیں موٹرانہ دینا پڑتا ہے۔''

نعیم نے ہوا میں دیکھتے ہوئے لمبی سی ''ایں.....؟'' کی اور پھر نہ سمجھ کر گھبرا گیا۔ ''ٹھہرو ٹھہرو۔ دیکھو'' لڑکے پر جھک کر بولا۔ ''یہ موٹرانہ کیا ہوتا ہے۔''

''جاگیردار نے موٹر خریدی ہے۔ ہمیں اناج دینا پڑتا ہے۔'' لڑکے نے کہا۔

''کتنا؟''

''یہ زمین کے حساب پر ہے۔ میرے پاس تین ایکڑ ہے اور ایک جوڑی ہے۔ میں نے ایک دھڑی دیا ہے۔''

''روشن آغا کے حصے میں سے؟''

''نہیں۔ اپنے حصے کا۔''

''کیوں؟''

لڑکا ہچکچا گیا۔ ''بس ہم پر لازم ہے۔''

''میں ضرور دیتا۔'' احمد دین نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''سو دفعہ دیتا چوہدری، پر میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اگر میں [illegible] یہ دیکھو''

اس نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیے۔ ''میں نے ساری زمین میں پھینک دی ہے۔ کسی نے میری مدد نہیں کی۔ میں نے خود ساری بیائی کی ہے۔ میرا بیٹا جنگ میں مارا گیا ہے اور آج انہوں نے مجھے پیٹا ہے میری داڑھی۔''

اس نے لرزتے ہوئے بدصورت ہاتھ نعیم کے آگے پھیلا کے رکھے۔ جن کے پورے خشکی کی وجہ سے تڑخ چکے تھے۔ نعیم جیب میں ہاتھ دیے سر جھکا کر چلتا ہوا واپس آ گیا۔ نیاز بیگ چھڑے کے تانگے سے باگیں مرمت کر رہا تھا۔

''تم نے بھی موٹرانہ دیا ہے؟'' صحن میں کھڑے ہو کر اس نے خفگی سے پوچھا۔

''ہماری تو اپنی زمین ہے۔ ہم کیوں دیں گے۔'' اس کے باپ نے چھاتی پھلا کر کہا۔ ''ہمارے نزدیک آنے کی ان میں ہمت ہے؟ سب کو سلا دوں۔ ہم نے کر اس جیتا ہے۔ کوئی مذاق ہے؟'' آنکھوں کے کونوں میں سے بیٹے کو دیکھتا ہوا وہ باگیں مرمت کرتا رہا۔

نعیم نے چولہے پر سے پکی ہوئی مٹی توڑی، اسے ہاتھ میں ملا، پھر اس میں کڑوا تیل ڈالا، چھت کے کونے میں سے مکڑی کا جالا انگلی پر لپیٹ کر اتارا اور اس میں ملایا اور پھر اسی مقدار میں تیل کا گوبر اس میں ملا کر اس کی لئی بنائی۔ یہ مرہم بیل کے زخم پر لگانے کے بعد اس نے اپنے فوجی تھیلے میں سے سفید پٹی نکالی اور باپ کی

سے اس پر باندھ دی۔

''اگر تم اسے خرگوش کے بچے کی طرح رکھنا چاہتے ہو تو پھر یہ کھیت میں کام کر چکا۔'' نیاز بیگ پٹی باندھتے ہوئے بھلایا۔

''جنگ میں یہ مرہم بڑا کام دیتا ہے۔ مگر اس میں تیتر کا گوبر بہتر رہتا ہے۔'' نعیم نے کہا۔

پھر اس نے گھوڑی پر زین کسی اور باگیں اس کے منہ میں ڈالیں۔ نیاز بیگ کھڑا چوڑی، اداس آنکھوں کے ساتھ اسے نہایت ہوشیاری سے ایک ہاتھ کے ساتھ سب کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب نعیم نے ٹوپی سر پر جما کر کونے میں سے نیزہ اٹھایا تو وہ بولا:

''لسی نہیں پیو گے؟''

''دشمنوں کی طرف پیوں گا۔ شکار پر جا رہے ہیں۔'' وہ اچک کر گھوڑی پر سوار ہوتے ہوئے بولا۔ گھوڑی بغیر کواڑ کے دروازے کے پھلانگ کر باہر ہو گئی۔

جنگل گھنا تھا اور وہ شیشم، کیکر اور جنڈ کے درختوں کے نیچے نیچے تین میل تک چلتے گئے۔ جگہ جگہ پر مردہ کوے اور دوسرے چھوٹے موٹے پرندے مرے پڑے تھے۔ چاروں طرف گلے سڑے پتوں اور پرندوں کی بیٹوں کی تیز جنگلی بو [illegible] کی نیچی زمین پر سے ہوتے ایک کھلی جگہ میں آ کر رک گئے۔ یہاں پر درخت کم تھے اور سورج کی روشنی ہموار زمین پر پڑ رہی تھی۔ کھلی جگہ دیکھ کر گھوڑے زور سے ہنہنائے۔

ایک سوار نے بڑی سی گالی دی۔ ''جگا دیں گے سالے۔'' اور تیزی سے لاٹھی گھوڑے کے سر پر دے ماری۔ وہاں پر سب اتر پڑے۔ سورج سر پر پہنچ چکا تھا۔

''اس وقت آرام کر رہے ہوں گے۔ یہ ان کے آرام کا وقت ہے۔'' گالی دینے والا سوار نعیم کو شکار کے باریک نکتے سمجھانے لگا: ''سوتے میں سے جگایا جائے تو اندھا ہو جاتا ہے۔ پھر اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ جدھر ہانک دو چلا جائے گا۔ اور اگر سامنے سے آ رہا ہو تو اپنی جگہ مت چھوڑو، دل میں خوف مت لاؤ۔ کھڑے رہو۔ جب بالکل نزدیک آ جائے تو ایک دم سامنے سے ہٹ جاؤ، سیدھا نکل جائے گا۔ یہ دس گز کے اندر اندر نہیں مڑ سکتا۔ اور تم۔ تم ہانکے میں رہنا۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے نعیم کے لکڑی کے بازو پر نظر ڈالی۔ ''نہیں، میرا مطلب یہ نہیں۔ تم دلیر آدمی ہو جوانوں سے لڑے ہو، یہ تو سور ہیں پر یہاں بڑے تگڑے جوانوں کی ضرورت ہے۔ سمجھے؟ تم ہانکے میں رہنا بس۔''

انہوں نے رات کے کھودے ہوئے گڑھوں میں سے گھاس اور لکڑیاں نکالیں۔ ایک قطار میں سات گڑھے تھے۔ جو گندر سنگھ اور چھ دوسرے جوان اپنے اپنے کھودے ہوئے گڑھے میں اتر کر بیٹھ گئے اس طرح کہ ان کے گھٹنے زمین میں گڑے ہوئے تھے اور صرف سر زمین کی سطح پر نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے نیزے سیدھے زمین کے ساتھ لگا

UrduPhoto.com

دیئے سر اور منہ پر کس کر منڈاسے باندھے اور ہانکے کا اشارہ دیا۔ نیزوں کے دستے ان کے کندھوں پر جمے تھے۔

ہانکے والے سب کے سب گھوڑوں پر سوار ہوئے اور جنگل میں غائب ہو گئے۔ گھنے درختوں میں سے لمبا چکر کاٹ کر وہ آدھے میل پر اسی سیدھ میں آنکلے اور چڑھائی کرتے ہوئے سپاہیوں کی طرح سیدھی قطار میں بڑھنے لگے۔ شیشم کے ایک جھنڈ میں انہیں سوروں کے ایک ریوڑ کے ملنے کی امید تھی لیکن وہ انہیں توقع سے پہلے ہی مل گئے۔ یہ ان سیاہ' فربہ' طاقت ور جانوروں کا ایک بہت بڑا ریوڑ تھا جس کا سواروں سے اچانک سامنا ہو گیا۔ سواروں نے سرعت سے پھیل کر نصف دائرہ بنایا اور انہیں گھیرے میں لے کر شور مچاتے ہوئے اس سمت میں ہانکنے لگے جدھر شکاری بیٹھے تھے۔ سارا جنگل قیامت کے شور سے جاگ اٹھا۔ پرندے پھڑپھڑا کر اڑے اور چھوٹے چھوٹے جنگلی جانوروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ سوار اپنے نیزے سروں سے اوپر اٹھائے' چیخیں مارتے ہوئے ہانکا لگا رہے تھے۔ سور اس اچانک حملے سے گھبرا کر چیخیں مارتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ نکلنے کی کوشش میں آخر کار اسی سمت میں بڑھتے جا رہے تھے جدھر کو ہانکے جا رہے تھے۔ اس وقت انسانوں' سوروں اور گھوڑوں کی چیخوں میں امتیاز کرنا ناممکن تھا۔ نعیم نے سارے جسم میں مکمل سرور کی وہ لہر دوڑتی محسوس کی جو انسان ہر انسانی قید سے آزاد ہو کر عمداً جانوروں کا رویہ اختیار کرتے وقت محسوس کرتا ہے۔ اس جنگلی ماحول میں جان لینے کی قدیم' ظالم انسانی خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی۔

آخر [illegible] میں غائب ہوگئے۔ وہ تیزی سے بھاگتے ہوئے ناک کی سیدھ میں جا رہے تھے۔ یک دم پانچ گز کے فاصلے پر نیزوں کے سرے بلند ہوئے اور انتہائی تمام تر برق رفتاری اور بوجھ کے ساتھ ان کے ساتھ ٹکرائے۔ نیزے ان کی گردنوں' پیٹھوں اور شانوں میں اتر گئے۔ زخمی جانور پیچھے ہٹے' چیخ مار کر آگے بڑھے' پیچھے ہٹے لیکن فولاد کی تیزانی کے آگے ان کی پیش نہ گئی اور نیزہ جو صرف آگے ہی آگے جا سکتا تھا ان کی فربہ' کندھی ہوئی چربی کی تہیں پھاڑتا ہوا نیچے اترتا گیا۔ نیزے کے دستے شکاریوں کے کندھوں میں گڑے جا رہے تھے اور وہ دانت بھینچ کر زور لگاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے انہیں تھامے بیٹھے تھے۔

UrduPhoto.com

پہلے ہلے میں صرف دو جانور رہے۔ سوار پھیل کر دو حصوں میں بٹ گئے اور گھوڑوں کو ایڑ لگا کر ریوڑ کے جنگل میں غائب ہونے سے پہلے ان کے آگے پہنچ کر انہیں واپس موڑ لائے۔ شکاریوں نے گڑھوں میں پانسہ پلٹ کر پوزیشن لی اور نیزے پیچھے سے آنے والے گلے کے سامنے کر دیے۔ جوگندر سنگھ کی سیدھ میں ایک سور آیا۔ اس نے دانت بھینچ کر نیزہ اس کے سینے پر جما دیا۔ نیزہ ایک طاقتور جھٹکے سے سینے کی سخت کھال اودھیڑتا ہوا شانے کی طرف بڑھا اور اپنے پیچھے سفید چربی کی لکیر کھینچتا ہوا باہر کو پھسل گیا۔ سور انتہائی تیز رفتاری سے آ کر اس کے گڑھے میں گرا اور اس کی تیز کینچلی نے شکاری کی پشت پر کندھے سے لے کر ریڑھ کی ہڈی تک چھ انچ لمبا گہرا گھاؤ ڈال دیا۔ جوگندر سنگھ کے منہ سے درد کی بلبلاہٹ اٹھی۔ دوسرے لمحے زخمی جانور ایک جھونکے کے ساتھ باہر نکلا اور

بھاگ گیا۔ اس بار بھی تین اور سؤر شکاریوں کے ساتھ زور آزمائی کر رہے تھے۔ اگلے ہلے میں چھٹا شکاری بھی مصروف ہو گیا تو ریوڑ کو نکل جانے دیا گیا۔ چیخیں مارتا ہوا خوف زدہ درندوں کا سیلاب برق رفتاری سے جنگل میں غائب ہو گیا۔ جو گندر سنگھ اٹھا اور شیشم کے ایک بڑے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور پشت پر سے خون بہہ رہا تھا۔

ایک بہت بڑے گھیر والے تنے کے پاس سے گزرتے ہوئے نعیم کو سؤر کی پچھلی ٹانگیں دکھائی دیں۔ گھوڑی کا رخ موڑ کر وہ دوسری طرف جا نکلا۔ سؤر جڑ کے پاس بیٹھا تھا اور سینے سے لے کر شانے تک اس کی کھال کا چیتھڑا لٹک رہا تھا۔ سفید سفید گھنی چربی میں سے خون نکل نکل کر زمین پر جمع ہو رہا تھا۔ وہ زخمی آنکھوں سے نعیم کی طرف دیکھتا ہوا پھنکارتے ہوئے بھاری بھاری سانس لینے لگا۔ گھوڑی زور سے ہنہنائی۔ اس وقت دفعتاً نعیم کے دل میں خوفناک، بے بس جانور کو دیکھ کر ایک تنگی، طاقت ور، پاگل خواہش پیدا ہوئی اور اس کے سوچنے کی قوت مفلوج ہو کر رہ گئی۔ وہ کود کر اترا اور نیزہ اس کے زخم پر رکھ دیا۔

سؤر نے خلاف معمول ایک خفیف سی جھرجھری لی اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔ نعیم نے نیزہ دبایا۔ سؤر زور سے سر جھٹک کر اٹھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ نعیم نے گھٹنے زمین میں گاڑ دیے اور کندھے پر نیزے کا دستہ جما کر ایک ہاتھ سے اسے تھامے رکھا۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ جانور اس کی طاقت سے باہر تھا۔ سؤر پھنکارا اور ایک جھٹکے سے آ[illegible] بے حد واضح طور پر نیزے کی انی کے چربی کی دبیز تہوں کو پھاڑنے کی آواز سنی 'کھرر...... کھرررر......'

"ہے...... کیا کرتے ہو چودھری۔" دور سے ایک آواز آئی اور وہ سب گھوڑے دوڑاتے ہوئے وہاں پہنچے اور کود کود کر اترنے لگے۔

'چھوڑو مت چودھری' زور لگاؤ۔ ہی شاباش...... ہی شاباش......" وہ چلائے۔ "نیزہ اونچا رکھو۔ آگے سے کندھا نیچا' گھٹنے گاڑو...... ہٹ تیرے سؤر کا۔"

"واہگرو...... یہ لونڈا کیا بیوقوفی کرتا ہے۔" ایک بڈھے سکھ نے غصے سے کہا۔ "اور پتہ ہے اس کا ایک ہاتھ ہے ایک......"

ان کے شور کے درمیان نعیم نے آنکھیں بھینچ کر بازو' کندھے' سینے اور ٹانگوں کا پورا زور لگایا۔ اچانک سؤر نے ایک اونچی' مرتی ہوئی چیخ ماری اور تھوتھنی نیزے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"سیدھا دل میں اتر گیا۔ میں تو آواز پہچانتا ہوں۔ ایسی چیخ اسی وقت اٹھتی ہے جب نیزہ دل میں اترتا ہے۔ میری تو عمر سؤروں میں گزری ہے۔" بڈھے سکھ نے چھاتی پھلا کر کہا۔

جانور کی ٹانگیں کانپیں اور وہ بھاری جسم کے ساتھ زمین پر آ رہا۔ مجمع میں سے ایک شور اٹھا۔ نعیم نے نیزہ چھوڑ دیا اور پرے کھڑا ہو کر پسینہ پونچھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنے شکار کی طرف دیکھے بغیر وہ گھوڑی کی باگ پکڑ

کر جوگندر سنگھ کی طرف چلا گیا۔ وہ جوان مرے ہوئے جانور میں سے نیزہ نکالنے لگے۔

جوگندر سنگھ شیشم کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ایک نوجوان سفید سوت جلا کر اس کی راکھ زخم میں بھر رہا تھا۔

"میں نے تمہارا بدلہ لے لیا ہے۔" نعیم نے کہا۔

وہ تکلیف اور درد کے درمیان مسکرایا "تم دلیر آدمی ہو۔ تم میرے بھائی ہو۔ مہندر سنگھ ہوتا تو وہ بھی بدلہ لیتا۔"

ایک لحظہ کے لئے نعیم کے دل میں تیز کانٹا ہوا درد سمٹ آیا۔

شام پڑ رہی تھی جب وہ واپس ہوئے۔ جوہڑ کے کنارے کتے بھونک رہے تھے اور اپلوں کے دھوئیں نے گاؤں کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ مغرب میں ابھی تک گزرے ہوئے دن کی سفیدی رکی ہوئی تھی اور مشرق آسمان پر ستارے ایک ایک کر کے ظاہر ہو رہے تھے۔ کھیتوں پر اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا اور بیچ بیچ نالیوں میں بہتے ہوئے پانی کا ہلکا شور ابھر رہا تھا۔ نیچی چھتوں والے خاموش گھروں میں دیئے تیزی سے بجھ رہے تھے کہ دن بھر بیلوں کے ساتھ کام کرنے والے کسان جلد سو جاتے ہیں۔

حویلی کی دیوار کے پاس سے گزرتے ہوئے روشن آغا کی بگھی کو دیکھ کر نعیم چونکا۔ گھوڑی روک کر وہ رکابوں میں اٹھا اور دیوار کے پار جھانکنے لگا۔ صحن میں گیس کے لیمپ جل رہے تھے اور انکے نیچے روشن آغا کے تقریباً سبھی مزارعے جمع تھے۔ وہ اپنے بہترین لباسوں میں تھے اور ان کی شوخ رنگ پگڑیوں کے بیچ کلے طرے آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ وہ دری پر بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور حقہ پی رہے تھے۔ منشی دیوان خانے کے دروازے پر ظاہر ہوا اور چھوٹی چھوٹی تیز آنکھوں کو گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اپنی باریک تیز آواز میں بولا:

"احمد دین......"

سب نے مڑ کر دیکھا۔ احمد دین گھٹنوں پر اٹھا۔

"اس کے مٹکے اناج سے بھرے ہیں اور اس نے "شکرانہ" نہیں دیا۔ روشن آغا کے سامنے پیش کیا جائے۔" منشی نے کہا۔

احمد دین سحر زدہ سا آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نئی ابرق لگی سفید پگڑی کا شملہ سیدھا کھڑا تھا اور اس نے لمبے لڑوں والا نیلا ریشمی تہمد باندھ رکھا تھا۔ اس کے تیل ملے ہوئے چہرے کی سیاہ جلد چمک رہی تھی۔

"بیل کی طرح ...... بیل کی طرح۔" منشی نے کڑک کر کہا اور نوجوان لڑکوں کی طرف دیکھا۔ لڑکوں نے اٹھ کر اس کی بغلوں میں ہاتھ دیئے اور گھٹنوں کے بل گرا دیا۔ ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر وہ چاروں ہاتھ پاؤں پر ہو گیا۔ منشی نے جھٹک کر اس کی پگڑی اتاری اور لڑکے کے ہاتھ میں دی۔

UrduPhoto.com

"بیل کو رسی ڈالو....." اس نے کہا۔ لڑکے نے پگڑی کا ایک سرا اس کے گلے میں باندھا' دوسرا ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"اس کے منہ میں چارہ دو۔" منشی نے کہا۔ ایک لڑکا خشک گھاس لا کر اس کے منہ میں ٹھونسنے لگا۔

احمد دین نے دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلائے اور پھٹی ہوئی آواز میں چلایا۔ "نہیں نہیں..... نہیں..... نہیں" اس کی باچھوں سے گھاس کے تنکے لٹک رہے تھے۔ لڑکوں نے گھاس ٹھونس کر اس کا منہ مضبوطی سے بند کر دیا۔ "چلو....." منشی رسی کھینچتے ہوئے بولا۔

بوڑھا کسان چوپایوں کی طرح زمین پر چلنے اور جلد جلد آنکھیں جھپکنے لگا۔ انتہائی ذلت کے احساس سے اس کا چہرہ بدنما ہو گیا' جیسے فالج زدہ یا میدان جنگ میں مرے ہوئے آدمی کا چہرہ ہوتا ہے۔

یکلخت بہت زیادہ گھبرا کر نعیم نے گھوڑی کی پسلیوں میں ایڑیاں ماریں اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ روشن آغا کی بگھی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کیکر کی چھڑی گھما کر اس کی چھت پر ماری جو پھسلتی ہوئی دروازے کے قریب جا گری۔ کچھ دیر کے بعد دروازے میں سے ایک سایہ نکلا اور پھیلتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

گلیاں ویران اور تاریک تھیں۔ گھوڑی اپنی مرضی سے چل رہی تھی کہ اس نے پیچھے آنے والے کے تیز قدموں کی چاپ [illegible]

"میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" آنے والے نے اس کی رکاب پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ نعیم نے تاریکی میں نوجوان سکول ماسٹر کی آواز پہچان لی۔ "میرے مکان تک چلو گے۔"

"تمہارا مکان کہاں ہے؟"

"وہاں....." ماسٹر نے اندھیرے میں شمال کی طرف اشارہ کیا۔ وہ گھوڑے سے اتر پڑا' کچھ دیر تک کھڑا سوچتا رہا' پھر باگیں پکڑ کر خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔

"آج بہت تھک گیا ہوں۔" چلتے چلتے نعیم نے کہا۔

"میں تمہیں بہتر چائے پلاؤں گا۔"

باقی راستہ انہوں نے خاموشی سے طے کیا۔

ایک چھوٹے سے شکستہ دیواروں والے صحن کو جس میں ایک گھوڑا کھڑا گھاس کھا رہا تھا' پار کر کے ماسٹر نے کواڑ کھولا۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا۔

"گھوڑی کو اُدھر باندھ دو۔" ماسٹر نے کہا۔ "میں روشنی کرتا ہوں۔"

کمرے کی دیوار کے ساتھ گندے شیشوں والی لالٹین لٹک رہی تھی۔ اس کے اوپر چھت دھوئیں سے سیاہ ہو چکی تھی۔ چھت کیکر کے ٹیڑھے میڑھے ڈنڈوں اور چھونس کی تھی۔ دیواروں پر جگہ جگہ بارش کے پانی کی لکیریں